بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

پاکستان جس معاشرے اور جس سیاسی ہیئت کا نام ہے وہ کسی انقلابی تحریک کا نتیجہ نہیں ہے کہ کوئی ایک اصولی طاقت یا کوئی ایک طبقاتی عنصر دوسری ہر طاقت کو توڑ پھوڑ کر فتح مندانہ شان سے ابھرا ہو اور خالص اپنے تقاضوں کے تحت ایک دستور بنا کر اسے نافذ کر دے۔ اس کے برعکس اس کا وجود قطعی طور پر تاریخ کے تدریجی تغیرات کا مرہونِ منت ہے۔ ایسی حالت میں صرف ایک تعمیری دستور کا بننا اور چلنا ممکن ہو سکتا ہے جو معاشرے کے عمومی رجحانات کے تحت مختلف مدارسِ فکر اور طبقات و عناصر کو کسی ایک نقطۂ مفاہمت پر جمع کرتا ہوا تدریجی اصلاح و تغیر کے لیے فضا کو سازگار بنا سکے۔ یہ نقطۂ مفاہمت تلاش کرنا اور اس پر مختلف عناصر کو مجتمع کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمارے ہاں اسی نقطۂ مفاہمت کی تلاش نے دستور سازی میں اتنا وقت[1] لگا دیا ہے کہ شاید اس کی مثال تاریخِ اقوام میں اور کہیں نہیں ملے گی۔ لیکن یہ تھا ناگزیر!

ایک طرف یہاں مسلم اکثریت ہے جس کی ہیئتِ اجتماعی کی بنیاد ہی اسلام پر استوار ہوتی ہے اور جو اسلام ہی کے نصب العین کو لے کر تحریکِ پاکستان کی منازل طے کرتی ہوئی آزادی کی منزل تک پہنچی ہے اور اب وہ اسلامی نظامِ حیات کا نقشہ سامنے رکھ کر تعمیرِ نو کرنا چاہتی ہے، لیکن دوسری طرف اسے غیر مسلم اقلیتوں کے مسئلے سے سابقہ درپیش ہے جس میں جو موقف اختیار کیا جائے وہ پوری بین الاقوامی فضا میں اچھا یا برا ردِ عمل دکھا سکتا ہے۔ اسی طرح یہاں ایک گروہ ایسا موجود ہے جو آنکھوں پر پٹی باندھ کر مغربیت کی راہ پر جانا چاہتا ہے اور اس رجحان میں اتنا انتہا پسند ہے کہ اسے اسلام، قرآن اور سنت کے الفاظ تک سے چڑ ہے، لیکن دوسری طرف یہاں مذہبی دائرے میں ایسے ذہن بھی موجود ہیں

[1] اس مدت کی غیر معمولی طوالت کا ایک بڑا سبب مفاد پرست طاقتوں کی باہم آویزی ہے

جو آج کے حالات، تقاضوں، ذرائع و وسائل، مسائل و معاملات سے بالکل بے تعلق رہتے ہوئے صدیوں پہلے کے ماحول میں سوچتے ہیں اور قرنوں پرانی اصطلاحات میں بات کہتے اور سمجھتے ہیں اور نیک نیتی سے اپنے جامد تصورات کو آج کی متحرک تاریخ میں نصب کرنا چاہتے ہیں۔ ان دو متضاد رجحانات کے درمیان تیسرا معتدل رجحان ہے جو یہ تقاضا کرتا ہے کہ اسلام کے اصول اور تقاضوں کو جدید حالات میں جدید اداروں کا قالب دے کر نصب کیا جائے اور جدید ذرائع و وسائل سے ایک مجتہدانہ طرزِ فکر کے ساتھ اس کے قیام و فروغ کی خدمت لی جائے۔ اور یہی وہ رجحان ہے جو رائے عام کو متاثر کر رہا ہے۔ پھر یہاں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ہر حال میں اقتدار کو اپنی اجارہ داری میں رکھنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے اپنے موجودہ معمول کے مطابق مستبدانہ اختیارات اور تشددانہ قوانین کے استعمال کی راہیں آئندہ دستوری ہیئت میں بھی کھلی رکھنا چاہتا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ صاف صاف طریق سے اپنی آمریت قائم کر دینے پر تُلا بیٹھا ہے۔ لیکن اس کے بالمقابل عوامی رجحانات پورے پورے جمہوری اور شہری حقوق کا تحفظ چاہتے ہیں اور کسی کی خداوندی کا جُوا اٹھانے پر تیار نہیں ہیں۔ پھر اس ملک میں یہ کشمکش بھی موجود رہی ہے کہ ایک طرف مرکز کو کنٹرول کرنے والے ہاتھ صوبائی طاقتوں کو اپنے قابو میں رکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف صوبائی طاقتیں مرکز کے مقابلے میں اپنے قدم جمائے رکھنے کی حریص ہیں۔ اسی طرح کچھ حقیقی اسباب کے تحت اور کچھ غلط کار لیڈروں اور تنظیموں کی مفاد پرستانہ سیاست کے زیرِ اثر پاکستان کے مشرقی اور مغربی بازوؤں میں مفاد کی کشمکش کار فرما ہو گئی ہے۔

ان سارے عوامل کے تحت مختلف عناصر میں جو کشمکش موجود تھی اور جسے بندگانِ مفاد کی گروہ بندیوں نے ایک فاسد مزاج دے دیا ہے، یہی وہ بلا تھی جس نے دستور سازی کے کام کو بار بار تعطل و التوا میں ڈالا اور بار بار اس میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔ اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر مارچ ۱۹۴۹ء تک بڑی مشکلوں سے مختلف رجحانات کا سمجھوتہ ایک قراردادِ مقاصد پہ ہو سکا۔ پھر مارچ ۱۹۴۹ء سے نومبر ۱۹۵۲ء تک کے دَور میں بڑی کاوشوں کے بعد بنیادی اصولوں کی رپورٹ پر فی الجملہ اتفاقِ رائے پیدا ہوا لیکن پھر ہمارے اربابِ اقتدار کو پارلیمانی نشستوں کے بٹوارے کا مسئلہ لے کے بیٹھ گیا۔ آخر محمد علی فارمولا پہ

یہ قضیہ طے ہوا - اس کے بعد گورنر جنرل اور وزارت کے اختیارات کی رسہ کشی سے سابقہ پڑا - گذشتہ ستمبر میں پروڈا کی تنسیخ اور گورنر جنرل کے اختیارات کی قطع و برید عمل میں آئی - ان منازل ہفت خواں سے گزرنے کے بعد اب مسودۂ دستور تکمیلی دور میں آپہنچا تھا اور گنتی کے چند روز اس کی منظوری اور نفاذ میں باقی تھے کہ دستوریہ کی لبِ بام پہنچی ہوئی کمند پر گورنر جنرل کے فرمانِ اکتوبر کا وار چل گیا اور ملک نامعلوم مدت کے لیے دستور سے محروم ہو گیا۔

پاکستان کے "انقلاب اکتوبر" کا اثر اتنا ہی نہیں تھا کہ دستوریہ کے کام میں تعطل پیدا ہو گیا اور سات برس کی محنتوں کے بھلے یا بُرے ثمرے سے قوم محروم رہ گئی، بلکہ عملاً نئی صورتِ حالات نے آمریت اور فوجی اقتدار کے خطروں کو قصرِ سیاست و اقتدار کے دروازے پر لا کھڑا کر دیا - دستوریہ کے ساتھ ساتھ سرے سے دستوریت (CONSTITUTIONALISM) خطرے میں پڑ گئی - جو لوگ دستوریہ کے خلاف سیاسی پروپیگنڈوں کا طوفان اٹھا رہے تھے جب نئی صورتِ حالات سامنے آئی تو ان کی بھی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ یہ کیا ہو گیا اور یہ کیا ہونے والا ہے!

دستوریت کی اہمیت کیا ہے؟

جس طرح افراد کو قانون (اخلاقی و عدالتی) ایک دوسرے کے مقابلے میں دھاندلی سے باز رکھتا ہے اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے جنگلی فارمولے کو نہیں چلنے دیتا، بلکہ وہ ان میں حالتِ امن قائم رکھتا ہے ٹھیک اسی طرح حکومت اور اس کے مختلف اداروں اور حکمران طبقے اور عوام کے درمیان دستوریت ایک منصفانہ توازن قائم کر کے قوت کو حق کی بنیاد بننے سے روکتی ہے اور اجتماعی نظام کو حالتِ امن میں رکھتی ہے - ایک بار دستوریت متزلزل ہو جائے تو پھر سوسائٹی کے مختلف مناصب اور اداروں کے درمیان حقوق و فرائض کی کوئی بھی تقسیم مستقل نہیں رہ سکتی - صدہا صدیوں کے تلخ تجربات کے بعد دورِ حاضر کی اجتماعی ہیئتوں نے دستوریت کو اپنے لیے لازم ٹھہرایا ہے، لیکن اسلام نے اپنی ہیئت کی بنیاد اوّل روز سے وحیِ الٰہی کی روشنی میں دستوریت پر رکھی ہے -

دستوریت میں رخنہ پیدا ہو جانے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک ملک میں کسی کے کوئی متعین حقوق باقی نہیں رہے اور نہ کسی کے اختیارات محدود ہیں۔ دوسرے لفظوں میں لادستوری نظام گویا ایک اندھی نگری ہے جس میں جو زور و قوت رکھتا ہو وہ جو چاہے کر گذرے۔ پولیس، فوج، عدالت، ہیڈ آف دی اسٹیٹ، وزارت، پارلیمنٹ (اگر باقی رہ جائے تو) جس موقع پر جس طرح کی سازش چاہے کرے اور اس کے نتیجے میں جو اقدام کر گذرے سو روا ہے۔ لادستوری حالت کی مثال گویا بازار سیاست میں چور بازار کی سی ہے۔ جو جس کی گرہ کاٹ سکتا ہو، ہاتھ کی صفائی کی کمائی کھا سکتا ہے یہ حالت جب پیدا ہو جاتی ہے تو سیاسی نظم کا استقلال (STABILITY) بالکل ختم ہو جاتا ہے کسی کو کوئی اندازہ نہیں ہوتا کہ صبح کے شام ہونے تک اور شام کے سحر ہونے تک کونسا نیا حادثہ یکایک واقع ہو جائے گا۔ رائے عام کی مداخلت سے حکومت آزاد ہو جاتی ہے اور چند افراد لاکھوں انسانوں کے قسمت گر بن جاتے ہیں۔ حکومت کے تمام اونچے ارباب اقتدار، تمام ادارے اور مناصب اور تمام محکمے ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں لگ جاتے ہیں اور تعمیر و ترقی یکسر رک جاتی ہے بین الاقوامی حیثیت سے ملک کی ساکھ تباہ ہو جاتی ہے اور دوسری قومیں ایسے فساد زدہ نظام پر اعتماد نہیں کر سکتیں سیاسی پارٹیوں کے لیے عوام میں کام کرنا ممکن نہیں رہتا اور اس طرح سیاسی ارتقاء رک جاتا ہے۔ پھر چونکہ لوگ ایسی نامطلوب حالت کو بدلنے کے لیے جائز راستہ نہیں پاتے اس لیے ان کے سیاسی رجحانات بدراہ ہو جاتے ہیں۔ علاوہ بریں جس ملک میں دو چار افراد کی خدائی چل رہی ہو اور سازشوں کی فضا میں ہر خدائی چار دن کی خدائی ہو، وہاں باہر کی امپیریلیسٹ طاقتوں کو اثر و نفوذ کے راستے کھلے مل جاتے ہیں۔

لادستوریت کے اس مہلک جہنم میں قوموں کو ہمیشہ ایسے لوگ دھکیلتے ہیں جن کو اپنی قوموں کے نفع و نقصان سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنے (یا کبھی کبھی اپنے گروپ کے) اقتدار کے لیے ایسے خوفناک نتائج رکھنے والی چالیں چل جاتے ہیں۔ خصوصاً جو لوگ چلتی ہوئی جمہوریت کے اندر آمریت کو منزل مقصود

بنا کر اقدام کرتے ہیں ان کا مرحلۂ اوّل یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اُٹھا کر دستور سے بلند و بالا کرتے ہیں اور پھر پہلا موقع پاتے ہی دستوریت کے گلے پر چھری پھیر دیتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ اس کارنامے کا احسان قوم اور عوام کے سر دھرتے ہیں۔ اس کی بے شمار تاریخی مثالوں میں سے ایک مثال ہٹلرازم کی ہے۔ اکثریت کے ووٹ کسی نہ کسی طرح مل رہے جانے کے بعد جب نیشنل سوشلسٹ گروپ آگے آگیا تو ۱۲ مارچ کو ریشتاغ کے ممبروں کا ایک خصوصی اجلاس طلب کیا گیا اور اس میں بائیں بازو کی پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے ارکان کو سرے سے دعوت ہی نہیں دی گئی۔ اسی میں ہٹلری حکومت کے نصب کا اعلان ہوا۔ ۲۳ مارچ کو اس اعضابریدہ پارلیمنٹ کا اجلاس ہوتا ہے جس میں کمیونسٹ اور سوشل ڈیموکریٹ ممبروں کی ایک بڑی تعداد جیل میں ہونے یا ملک سے باہر چلے جانے کی وجہ سے حصہ لینے سے محروم تھی۔ اس ریشتاغ سے ہٹلری حکومت نے آمرانہ اختیارات کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ چار سال کے لیے ریشتاغ حکومت کو قانون سازی کے اختیارات دے کر پیچھے ہٹ گئی ...

.... بہ تعبیر جس "قانونِ آمریت" (ENNABLINGLAW)

کے ذریعے واقع ہوا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ قانون سازی صرف دستور کے متعین اسلوب پر ہی کرنا ضروری نہیں بلکہ ریش گورنمنٹ خود بھی قانون بنا سکتی ہے اور ریش گورنمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین دستور سے منحرف بھی ہو سکتے ہیں۔ ہٹلر نے اعلان کیا کہ مامور شدہ وزراء غیر معین مدت کے لیے کام کرتے رہیں گے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آمریت کا راستہ ہی لادستوریت ہے، چاہے جرمنی میں اٹھے، ترکیہ میں، مصر میں یا کسی اور سرزمین میں!

زندہ رائے عام ہی ایک طاقت ہے جو اس بلائے بے درماں سے سوسائٹی اور سیاسی ہیئت کو بچا سکتی ہے۔ لیکن رائے عام کے علی الرغم یہ تلوار اگر کسی معاشرے کے سر پر لٹک جائے تو اس کے وار کو روکنے میں عدلیہ بڑا پارٹ ادا کر سکتی ہے۔ چنانچہ جمہوریت کی تاریخ میں عدلیہ نے جمہوری قدروں اور عوام کے حقوق کو غاصبوں سے بچانے کے لیے بڑے نزرین کارنامے پیش کیے ہیں۔ لیکن عدلیہ بھی آمریت کے خطرے کے مقابلے میں کوئی نتیجہ خیز کارنامہ جبھی سرانجام دے سکتی ہے کہ رائے عام دستوریت اور قانون کے احترام کی محافظ ہو۔

یہ اللہ کا فضل ہے کہ آمریت نے ہمارے دروازے پر اولین دستک دی تو رائے عام نے اس کا خیر مقدم

ایک جذبۂ نفرت سے کیا ہو۔ اس قضایا میں سندھ چیف کورٹ نے جو فیصلہ دستور یہ اور حکومت کا اختلاف رفع کرنے کے لیے صادر کیا ہے (قطع نظر اس کی قانونی حیثیت کے، کیونکہ یہ حیثیت تو اب فیڈرل کورٹ میں زیر بحث ہے)۔ سیاسی لحاظ سے وہ دستوریت و جمہوریت کی آبرو کو بچانے والا فیصلہ ہے، اور اس فیصلے نے ہماری عدلیہ کو ایک تاریخی مرتبہ دے دیا ہے۔ ان اچھے شگونوں کے ہوتے ہوئے ہم پُر امید ہیں کہ یہاں انشاء اللہ آمرانہ رجحانات کو کچھ زیادہ آگے بڑھنے کا موقع نہیں ملے گا۔

اب فیڈرل کورٹ میں اس مقدمے کی کارروائی کے دوران میں یکایک فریقین کے درمیان مصالحت کی تحریک شروع ہو گئی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ملک کو از سرِ نو دستوریت کی راہ پر ڈالنے کی صرف یہی ایک صورت باقی ہے۔ کیونکہ فیصلہ اگر دستوریہ کے خلاف اور گورنر جنرل کی پوزیشن کے حق میں جاتا ہے تو دستوریہ کا اب تک کا کیا کرایا آئینی قدر و قیمت کھو بیٹھے گا اور اس سے بڑی بھاری ملکی اور بین الاقوامی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں جن کا حل آسان نہیں۔ اور فیصلہ اگر دستوریہ کے حق میں جاتا ہے تو گورنر جنرل اور موجودہ وزراء پر ایک ایسی غیر آئینی حیثیت چپک جائے گی جسے کوئی بھی اپنے لیے پسند نہیں کر سکتا۔ اس صورت میں ملک کی قسمت دستوریہ کی قانونی پوزیشن اور حکومت کے عملی اختیار کے درمیان اسی طرح لٹک جاتی ہے جیسے وہ برطانیہ میں بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان ایک بار معلق ہو گئی تھی۔ پس راہِ نجات اب مصالحت ہی ہے، بشرطیکہ فریقین ذہانت اور فراخ دلی سے کام لیں اور ذاتی اور گروہی مفاد کے بجائے ملکی مفاد کو پیش نظر رکھیں۔

مصالحت کی جو صورت بطور تجویز سامنے آئی ہے اُس پر سوچنے سے قبل ایک اور تجویز بھی زیر غور لائی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ جو مسودۂ دستور ہفت سالہ صرفِ قوت و مال سے ایک مناسب شکل اختیار کر چکا ہے، ایک بار اُس پر بھی تو نگاہ ڈال لی جائے کہ آیا وہ کسی قدر ردّو بدل کے ساتھ فریقین کے لیے قابلِ قبول ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس کا اسلامی عنصر تو چند کوتاہیوں کے باوجود (جن کو پورا کیا جا سکتا ہے) پوری قوم کا متفق علیہ ہے۔ لے دے کر ایک مسئلہ مغربی پاکستان کے ایک یونٹ بنانے کا ہے اور دوسرا شاید گورنر جنرل کے اختیارات کا ہو۔ تو کیوں نہ ان دونوں مسائل میں مفاہمت کر کے پیش نظر مسودہ کو نئی

صورت میں لی جائے اور ایک آدھ مہینے کے بعد اسے نافذ کر دیا جائے۔ اس سے ملک الیکشن کے مصارف اور وقت کے ضیاع سے بھی بچے گا اور موجودہ ادھ کچری حالت سے بھی ایک ہی جست میں نکل سکے گا۔ اصل شے تو دستور ہے، اگر وہ ہماری ضروریات کو پورا کر دے تو آخر اس صنم صندا کی کیا وجہ کہ یہ دستوریہ نہ ہو، لازماً ایک نئی دستوریہ ہی بنے۔ موجودہ دستوریہ کے کٹر مخالفین میں سے نمایاں ترین ہستی وزیر قانون مسٹر سہروردی کی ہے، لیکن ان کا بھی حال یہ ہے کہ وہ چند نامزد وزراء کا ایک کمرے میں بیٹھ کر بنایا ہوا دستور قبول کر سکتے ہیں تو پھر موجودہ دستوریہ اس وزارت سے زیادہ غیر نمائندہ تو نہیں۔

لیکن اگر یہ تجویز معقول وجوہ کی بنا پر قابل قبول نہ ٹھہرے تو پھر مفاہمت کسی ایسی صورت پر ہونی چاہیے جس کے ذریعے واقعی ایک نمائندہ تر دستوریہ کا انتخاب[1] فوراً عمل میں آئے۔ یہ نہ ہو کہ موجودہ دستوریہ نئی دستوریہ کے انتخاب کا کام حکومت کو سونپ کر خود مستعفی ہو جائے اور پھر کوئی ایسی ایمرجنسی پیدا ہو کہ حکومت انتخابات کو ٹال دے اور وہی خطرناک دستوری خلا پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے آج ہم گوناگوں الجھنوں سے دوچار ہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ موجودہ دستوریہ دستور سازی کا کام روک دینے کے فیصلے کے ساتھ ایک قانون کے ذریعے اپنے آپ کو انتخاب کرانے والی مشینری میں بدل دے اور پولنگ کی آخری تاریخ کا قطعی تعین کر دے، اور یہ بھی طے کر دے کہ جونہی نئی دستوریہ کا پہلا اجلاس منعقد ہو گا یہ آٹومیٹک طریق پر موقوف ہو جائیگی۔ اس صورت میں اگر انتخابات کسی وجہ سے موخر ہوئے تو ساورن باڈی موجود رہے گی۔ بخلاف اس کے اگر دستوریہ موجودہ حکومت کو اپنا جانشین بنا کر رخصت ہو گئی تو پھر کوئی نہیں جانتا کہ ملک کو کیسے مستقبل کا سامنا کرنا ہو گا۔

ہم ہر لحاظ سے بہتر تو یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ مسودۂ دستور پر مفاہمت ہو جائے، لیکن اگر یہ نہ ہو سکے تو ہم بڑی مسرت کے ساتھ نئی دستوریہ کے ڈائرکٹ انتخابات کا خیر مقدم کریں گے۔ ڈائرکٹ انتخابات ہوں تو دستور سازی کی مہم از سر نو رائے عام سے مربوط ہو جاتی ہے، اور معاملات اگر رائے عام کے زیر اثر آ جائیں تو پھر مفاد پرستانہ ر ۴۲۶

[1] یہ انتخاب موجودہ اسمبلیوں کے واسطے سے نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ ایک تو خود ان کی نمائندہ حیثیت قابل بحث ہے۔ دوسرے ان کا انتخاب دستور سازی کی ضرورت کو سامنے رکھ کر نہیں کرایا گیا۔

(بقیہ اشارات)

تبدیلیوں اور ان کے سازشی جوڑ توڑ سے نجات مل سکتی ہے۔ یہ انتخابات چونکہ ملک کے مستقبل کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہونگے لہٰذا ہر نظریہ اور ہر مکتب خیال اپنا آخری زور صرف کر دے گا اور اس کھلی مسابقت میں انشاءاللہ اسلامی نظریہ ایک مضبوط طاقت ثابت ہوگا۔ قوم جن لوگوں کے اندر اسلام سے گریز کے رجحانات کا تجربہ کر چکی ہے اُن سے نجات پانے اور زیادہ مخلص اور قابل اعتماد لوگوں کو آگے لانے کا یہ ایک بہترین موقع ہوگا۔ پھر جو عوام کی منتخب کردہ نئی دستوریہ کام کرنے بیٹھے گی وہ کبھی بھی رائے عام سے بے نیاز ہو کر کام کرنے کی جسارت نہیں کریگی پس کوئی وجہ نہیں کہ وہ کوئی غیر اسلامی دستور ملک کے اوپر ٹھونسنے کے منصوبے پیش نظر رکھے۔ وہ نہ صرف پچھلے مسودے کے متفق علیہ اسلامی اجزا کو قبول کرے گی بلکہ ان میں جو کوتاہیاں چھوڑی گئی ہیں ان کو بھی پورا کرے گی۔ ضرورت اس کی ہے کہ دستور سازی کا سارا کام رائے عام کے زیر اثر ہو۔

ایک خاص طبقے کے بعض لوگ کچھ اور ہی نیتوں کے ساتھ اس پیچیدہ صورت حالات سے امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کی خواہش پنہاں یہ ہے کہ کسی طرح اس ادلا بدلی میں ملک کو دستور کے اسلامی اجزاء سے محروم کر دیا جائے۔ ہمارے یہ اکابر مسلمان خصوصیت سے "کتاب و سنت" کے الفاظ پر اندر ہی اندر بہت کڑھ رہے ہیں۔ انہی بڑے بڑے مرتبے کے مسلمانوں کا ذہن ہے جو کبھی "کراچی ٹائمز" اور کبھی "پاکستان اسٹینڈرڈ" کے اداریوں میں کھولتا ہوا سامنے آتا ہے۔ اپنے ان بھائیوں کو ہم خیر خواہانہ جذبے کے ساتھ متنبہ کرتے ہیں کہ رائے عام کے خلاف اس طرح کی سازشیں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گی، بلکہ وہ جتنا کچھ لوگوں سے سلب کرنے کی کوشش کریں گے اُس سے زیادہ اُن کو واپس کرنا پڑے گا۔ وہ اپنی مجالس میں بیٹھ کر جیسے چاہیں رنگ جمالیں، عوام میں اُن کے رجحانات کی کوئی کھپت نہیں ہے۔ اس کا اندازہ وہ اُس ہمہ گیر ردِ عمل سے کر سکتے ہیں جو "سنت" پر فرید جعفری صاحب کے حملے کے زیر اثر پاکستان کے دونوں خطوں میں ظاہر ہو رہا ہے۔ آپ حضرات کا تصورِ اسلام کچھ بھی ہو، اجتماعی نظام تو بہر حال اجتماعی تصور ہی کے تحت چلے گا۔ اگر پاکستان کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کتاب و سنت کو فکر و عمل کی اساس اور زندگی کی ہدایت کا سرچشمہ مانتی ہے تو پاکستان کا دستور تو اکثریت ہی کے ایمان کے مطابق تشکیل پائے گا، چاہے اونچے سیاسی شیش محلوں میں زندگی بسر کرنے والے چند افراد کو کتاب و سنت کے الفاظ سے کتنی ہی شرم کیوں نہ محسوس ہو۔ یہ ملک سنت کا انکار کرنے والوں کا ملک نہیں ہے اور یہ ریاست رسول اللہ صلعم کے ارشادات اور عملی کردار کے مخالفین کی ریاست نہیں ہے۔ یاد رکھیے کہ ایک بار "کتاب و سنت" پر پیمان باندھ لینے کے بعد آپ حضرات نے اگر اس پیمان کو واپس لینے کی کوشش کی تو آپ کا اخلاص قطعی طور پر مشتبہ ہو کر رہ جائے گا۔